دو قومی نظریہ
اور
پاکستان
پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
ایم۔اے؛ پی۔ایچ۔ڈی
ادارۂ مسعودیہ
۲/۶۔۵۔ای، ناظم آباد۔ کراچی، (سندھ)
اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء

دو قومی نظریہ اور پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

.... (۱) ....

دو قومی نظریہ کا بنیادی تصور اسلام نے پیش کیا۔ مسلم اور غیر مسلم۔ قوموں کی تعمیر افکار سے ہوتی ہے، قرآنی تعلیمات سے جس فکر کی تعمیر ہوتی ہے وہ اس فکر سے قطعاً مختلف ہے جو قرآنی تعلیمات سے نا آشنا ہو، اسی لئے اسلامی فکر جس قوم کی تشکیل کرتا ہے وہ دوسری اقوام سے مختلف ہوتی ہے۔ فکر و خیال کا یہی تضاد و اختلاف دو قومی نظریہ کی معقول بنیاد ہے۔ "نظریاتی قومیت" اور "نظریاتی سلطنت" کا تصور اسلام نے پیش کیا اور اس پر عمل کر کے دکھایا، آج چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی مشرق و مغرب میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ کسی نے قومیت کو رنگ سے وابستہ کیا، کسی نے زبان سے، کسی نے جغرافیائی حدود سے، کسی نے نظریات سے۔ جس نے قومیت کو رنگ سے وابستہ کیا وہ اپنے کئے پر خود پشیمان نظر آتا ہے۔ انگریزوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جس قوم نے قومیت کو زبان سے وابستہ کیا وہ اس بنیاد پر اپنے اندر کامل اتحاد پیدا نہ کر سکی۔ عربوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جس قوم نے قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود پر رکھی وہ بھی اس بنیاد پر متحد نہ ہو سکی اور وہ اخوت پیدا نہ کر سکی جو قومیت کا مقصود ہے۔ ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے، معلوم ہوا کہ قومیت کی تعمیر کے لئے یہ تینوں بنیادیں کمزور رہیں۔

اب آیئے نظریہ کی طرف، دنیا کی کچھ حکومتیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے قومیت کی بنیاد نظریات پر رکھی ہے۔ مثلاً روس، چین، امریکہ، پاکستان وغیرہ یہاں کے عوام کا حال دوسری سلطنتوں سے مختلف ہے۔ اصل میں اسلام نے اتحاد کی بنیاد دل و دماغ پر رکھی ہے کہ اصل اتحاد فکر و خیال کے اتحاد ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نظریاتی حکومتیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ اب نظریہ جتنا جاندار ہو گا اور اس پر عمل جس اخلاص سے کیا جائے گا اتنی ہی جاندار حکومت ہو گی۔ اسلام کی تاریخ نہایت روشن ہے، اسلام کے جاندار پیغام نے دوسرے مذاہب والوں کو اتنا متاثر

کیا کہ انھوں نے اپنے اپنے مذہب چھوڑ دیئے اور اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ پاکستان کو یہ سعادت حاصل ہے کہ صوبہ سندھ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ایمان لائے خود صحابی بنے اور اپنے ساتھ اور صحابہ لے کر آئے اور سندھ میں اسلام کی روشنی پھیلائی۔

محمد بن قاسم کے حملے سے تقریباً ۹۰ سال پہلے کی یہ بات ہے۔ اس عرصے میں سندھ میں دور و نزدیک اسلام پھیل چکا تھا۔ بات سے بات نکلتی جاتی ہے۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ اسلام کے پیغام میں بڑی کشش ہے اور اسلام کی تعلیمات میں بڑی جاذبیت ہے۔ اب اگر اسلام پر صحیح طور پر عمل نہ کیا جائے اور اس کے اصل حسن و جمال کو نہ دکھایا جائے تو اس میں اسلام کا کیا قصور، قصور عمل نہ کرنے والوں کا ہے اور اس کے لئے ہم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مذہب کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ جن کا کوئی مذہب نہیں ان کا بھی مذہب ہے، وہ بھی کسی دستور کے سہارے جیتے ہیں، خلاء میں نہیں رہتے اور دستور ہی اصل مذہب ہے۔ اسلام کے نزدیک مذہب رسم و رواج کا نام نہیں، دستور زندگی کا نام ہے۔ دنیا کی تمام نظریاتی حکومتوں نے کسی نہ کسی انداز سے اسلام سے اکتساب فیض کیا ہے، اس کا بخوبی اندازہ اسی کو ہے جس کی نظر ادھر بھی ہے اور ادھر بھی۔

بہرکیف بات تھی دو قومی نظریے کی۔ پاک و ہند کی تاریخ میں خاص طور پر دو ادوار ایسے آئے جب اس تصور کے احیاء کی کوشش کی گئی، یہ اس وقت ہوا جب اسلام کے شعائر و نشانات مٹانے کی کوشش کی گئی۔ پہلی بار دسویں صدی ہجری میں اکبر بادشاہ کے عہد میں سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مرشد کے مرشد حضرت شاہ فضیل علیہ الرحمتہ سندھ کے تاریخی شہر ٹھٹھہ کے قبرستان مکلی میں آرام فرما ہیں اور جن کی اولاد صدیوں سے سندھ میں آباد ہے۔ ہاں تو حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے بارہویں صدی ہجری میں عہد جہاں گیری میں اسلامی انقلاب آیا اور پاک و ہند میں شریعت اسلامیہ کو غلبہ حاصل ہوا۔

دوسرا دور وہ ہے جب چودھویں صدی ہجری کے نصف اول میں مسٹر گاندھی کی کوششیں رنگ لائیں مسلمان اسلامی شعائر کو چھوڑنے لگے اور ہندو شعائر اپنانے لگے۔ بات بگڑنے لگی،

اس موقعہ پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے پوری توانائی کے ساتھ دو قومی نظریہ کا احیاء کیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کو سندھ کے مشہور عالم شیخ ہدایت اللہ بن محمود بن محمد سعید السندھی نے ۱۹۱۲ء میں "چودھویں صدی کا مجدد" لکھا ہے اور جن کو ہمارے ٹھٹھہ کے بزرگ جناب اللہ بخش عقیلی مرحوم نے ۱۹۲۲ء میں اپنے ایک مقالے میں اسی لقب سے نوازا۔ مولانا احمد رضا خاں تبحر عالم تھے۔ سائنسی علوم میں بھی ان کی بہت سی عربی و فارسی کتابیں ہیں۔ ان کے خلفاء و تلامذہ اور متبعین کے پاکستان پر بہت احسانات ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں پاکستان کے جہاں دیدہ و سن رسیدہ صحافی میاں عبدالرشید نے اپنی کتاب "پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر" (مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء) میں مولانا بریلوی اور ان کے سیاسی خدمات پر مفصل ایک باب باندھا ہے۔ یہ کتاب ادارہ تحقیقات پاکستان (پنجاب یونیورسٹی) نے شائع کی ہے۔

دو قومی نظریہ کے نفاذ کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے خیالات اچھے نہ تھے اور ان کا عمل بھی صحیح نہ تھا جس سے مستقبل کے خطرات پیدا ہو گئے تھے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ لکھنی پڑتی ہے۔ پھر مسلمان اور ہندو دونوں کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق تھا مثلاً

۱۔ مسلمان جا ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے' ہندو کئی خداؤں کو پوجتے تھے۔

۲۔ مسلمان قرآنی تعلیمات پر عمل کرتے تھے' ہندو گاندھی کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ مسلمان کے ہاں جو چیز حرام تھی ہندو کے ہاں حلال تھی۔

۴۔ مسلمان پورے ہندوستان میں اردو کو نافذ کرانا چاہتے تھے۔ مسٹر گاندھی ہندی کو نافذ کرانا چاہتے تھے۔

الغرض دونوں کے نظریات میں بنیادی اختلاف و تضاد تھا۔ مزید برآں مسلمان حکومتوں میں تو کبھی ہندو مسلم فساد نہ ہوئے البتہ جب انگریزوں کی سلطنت آئی تو ہندو مسلم فساد ہونے لگے اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ مسلمان کے اقتدار میں ہندو امن سے رہ سکتا ہے۔ مگر ہندو کے اقتدار میں مسلمان امن و چین سے نہیں رہ سکتا۔ اور یہ بات تاریخی حیثیت سے غلط بھی نہ تھی۔ تقسیم ہند کی تحریک کا یہی سب سے بڑا محرک ہے جس جذبے کے تحت پاکستان کا مطالبہ کیا

گیا۔ ہم نے تو دکھا دیا کہ پاکستان میں ہندو مسلم کیسے شیر و شکر رہتے ہیں۔ مگر ۳۵ برس گزر جانے کے بعد ہندوستان اب تک یہ ثابت نہ کر سکا بلکہ اس طویل عرصے میں وہاں سات ہزار (۷۰۰۰) سے زیادہ ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں۔ جس میں ہزاروں مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ ایک عجیب لطیفہ یہ ہے کہ اپنا تو محاسبہ کرتے نہیں اور مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ یہ ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی فطرت جھگڑالو ہوتی تو پاکستان میں اس کا ادنیٰ سا تو اظہار ہوتا۔ مگر دین اسلام نے غیر مسلموں سے ایسی رواداری سکھائی جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ان کے عبادت خانوں کی حفاظت' ان کی جان و مال کی حفاظت' ان کے لئے علاج اور تعلیم کی مفت فراہمی حتیٰ کہ اگر کوئی ان پر حملہ کرے۔ تو مسلم حکومت پر لازم ہے کہ ان کی حفاظت کا انتظام کرے اور ان کے لئے دشمن سے جنگ کرے' خود ان کو جنگ کی تکلیف نہ دے۔ اسی جذبہ رواداری کے تحت راقم السطور نے مٹھی (ضلع تھرپارکر) میں کالج قائم کیا جہاں اسی (۸۰) فیصد ہندو آباد ہیں۔

دو قومی نظریہ کا تعلق مذہب سے ہے اس لئے اس سے افراد کا وابستہ رہنا اسی وقت ممکن ہے جب ان کو دین سے گہرا لگاؤ ہو اور وہ سیاسی و تاریخی حیثیت سے باخبر ہوں۔ ہر نظریہ کی ایک بنیاد ہوتی ہے اگر یہ مضبوط نہ ہو تو نظریہ خلا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں علماء دین کے احسان کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے افراد ملت کو دین سے وابستہ رکھا۔ ورنہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تو ایسے افراد پیدا نہیں ہوتے جو دو قومی نظریہ کی بنیادوں کو استوار کریں بلکہ زیادہ تو منتشر الخیال افراد سامنے آتے ہیں کیونکہ نصاب میں کوئی ایسی چیز نہیں جو لازمی طور پر ان کے فکر و خیال کی پرورش کر کے ان کو سچا مسلمان اور محب وطن بنائے فکر و خیال بھی بنانے سے بنتے ہیں ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو پھر ہر سنی سنائی پر عمل کر کے اپنے اور دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ بہرکیف ایک دو سال سے تعلیمات اسلامیہ اور پاکستان کی تاریخ سے متعارف کرنے کا انتظام کیا گیا ہے مگر یہ ناکافی ہے۔ پھر یہ مضامین اعلیٰ سطح پر ۳۵ برس بعد نافذ ہوئے ہیں جب کہ زمین سخت ہو گئی ہے۔ بہرکیف دیر آید درست آید۔

.... (۲) ....

غیر منقسم ہندوستان میں برسہا برس سے ہندو مسلم ساتھ رہتے چلے آرہے تھے' کبھی الگ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پاک و ہند کے مسلمان طبعاً" رواداررہیں' روادار نہ ہوتے تو ایک ہزار برس کے طویل دور حکومت میں ہندو الگ حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے کیونکہ وہ اکثریت میں تھے اور عقل و دانائی میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ مگر اکثریت کے باوجود ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی جس سے مسلمانوں کی بے مثال رواداری کی تصدیق ہوتی ہے اور تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں۔ ایک جہاندیدہ ہندو مورخ نے بڑی دل لگتی بات لکھی ہے اس نے لکھا ہے کہ اگر مسلمان روادار نہ ہوتے اور تلوار سے اسلام پھیلاتے تو کم از کم ان شہروں میں جو مسلمان سلطنتوں کے دارالسلطنت رہے مسلمان اکثریE ٰمیں۵yوتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ غیر منقسم ہندوستان میں (پاکستان وجود میں آنے سے قبل) وہ' آگ مٰدادےع Ivہور وغیرہ میں مسلمان اقلیت میں تھے یہ وہی شہر ہیں جو کبھی مسلم سلطنتوں کے دارالسلطنت رہے۔ رواداری کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا تو مسلمان بادشاہوں کی دیرینہ ہندو رعایا نے اپنے بادشاہوں اور حاکموں کو کمزور اور بے دست و پا دیکھ کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے لئے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ شروع شروع میں تو بات صاف نہ تھی مگر آگے چل کر یہ معلوم ہوا کہ اصل مقصد ہندو اکثریت کو اقتدار دلانا ہے۔ بات اقتدار کی تھی اس لئے جو ہزار سال تک حکمران رہا وہ اتنی جلدی اپنی رعایا کا محکوم نہ ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ رعایا نے محسن کو بھلا دیا ہو بلکہ محسن کے جان و مال کے درپے ہو گئی ہو اور وہ بھی انگریزوں کی غلامی میں رہ کر' تو سوچنے والوں نے سوچا کہ جب غلامی میں اس کا اپنے محسنوں کے ساتھ یہ سلوک ہے تو آزادی ملنے کے بعد کیا ہوگا۔ مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی اس انداز فکر کو لے کر آگے بڑھی اور اس کو علم و آگاہی علماء اہل سنت نے بخشی۔

ہندو اکثریت کی زیادتیوں کا یہ عالم تھا کہ خود دارالسلطنت دہلی میں کوئی مسلمان ہندو کے

برتن یا اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر لگاتا تو اس طرح پیچھے دھکیل دیا جاتا جیسے وہ کوئی اچھوت ہے۔ خود مجھ کو بچپن میں کئی بار یہ تجربہ ہو چکا ہے۔ گویا عملی طور پر عام ہندوؤں کی نظر میں مسلمان اچھوتوں سے بدتر تھے۔ اس لئے پاک و ہند میں انہوں نے مسلمان کو تعلیمی، اقتصادی اور سرکاری میدانوں میں آگے بڑھنے نہیں دیا۔ طرح طرح سے ان کو زک پہنچانے کی کوشش کی، ذرا ماضی قریب کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھیں۔

۱۔ مسٹر گاندھی کی ایما پر ترک گاؤ کشی کی تحریک چلی تاکہ بزور قوت اسلامی شعار چھڑوا کر مذہبی اور فکری طور پر انہیں مرغوب و مفلوج کر دیا جائے۔

۲۔ تحریک ترک حیوانات چلائی تاکہ سارے مسلمان قصاب اپنی روزی سے محروم ہو جائیں۔

۳۔ تحریک کھدر چلائی تاکہ ڈھاکہ، ٹھٹھہ، بنارس وغیرہ کے نفیس کپڑا بننے والے مسلمان پارچہ ساز بے کار ہو جائیں۔

۴۔ پھر تحریک ہجرت چلائی تاکہ مسلمان اپنی جائیدادیں اور زمینیں بیچ کر ملک سے چلے جائیں اور سارا مال ہندوؤں کے ہاتھ آ جائے، اس تحریک سے سندھ کے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا، پہلے ہی کون سی جائیدادیں و زمینیں ان کے پاس تھیں جو کچھ تھا وہ اس بہانے سے لے لیا گیا۔

۵۔ پھر تحریک ترک موالات چلائی تاکہ مسلمان سرکاری ملازمتوں اور سرکاری اعزازات سے محروم ہو جائیں اور انگریزوں کی نگاہ میں آ جائیں۔

۶۔ پھر تحریک شدھی سنگھٹن چلائی، مسلمانوں کو بالجبر مرتد بنایا گیا ان کی تہذیب و تمدن کو پامال کرنے کی کوشش کی گئی۔

۷۔ پھر تحریک آزادی ہند چلائی اور مسلمان علماء او عوام کی بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔

۸۔ ان سب کوششوں کے باوجود جب کام نہ بنا اور پاکستان بن گیا تو پورے ہندوستان میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرایا گیا، لاکھوں مسلمانوں کو صرف اس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا کہ انہوں نے ہندوؤں کی رعایا بننا پسند نہ کیا، پاکستان کی حمایت کی اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ وہ مسلمان کہلاتے تھے۔

الغرض طرح طرح سے مسلمانوں کو تباہ کرنے کے حیلے بہانے ڈھونڈے گئے۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے جس کو زبان پر لاتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم کسی قوم کے حقوق تلف کرتی ہے اور اس کی جان و مال کے درپے ہوتی ہے اور اس کو نفرت و حقارت سے دیکھتی ہے تو وہاں علیحدگی اور بغاوت کے جراثیم پنپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے دانائی اور ہوشمندی یہ ہے کہ کسی کا حق تلف نہ کیا جائے۔

ناانصافیوں کا علاج قوت یا وعدوں سے ممکن نہیں' اس کا علاج عمل سے ہوتا ہے۔ اس لئے عملی ثبوت دینا چاہئے۔ اگرچہ اکثریتی طبقہ اپنی اکثریت کی بناء پر اقلیتی طبقے کے حقوق تلف کرنے کی حیثیت میں ہوتا ہے مگر عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کا حق نہ مارا جائے اور سب کے حقوق کی پاسداری کی جائے' اسلام نے یہی تعلیم دی اور یہی کر کے دکھایا ہے۔

دنیا سے تشریف لے جاتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر آخری کلمات انہیں حقوق کی پاسداری سے متعلق تھے' آپ نے معاشرے کے ہر طبقے کو اس کا حق دلوایا اور یہی وہ انقلاب تھا جو اسلام نے معاشرہ میں پیدا کیا اور اسی انقلاب کی دیکھا دیکھی دنیا میں ہر جگہ انقلاب آنے لگے۔

بہرحال عرض یہ کرنا تھا غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کا احساس محرومی اور احساس عدم تحفظ تقسیم ہند کا ایک بڑا سبب ہے۔

انہی حالات و واقعات کی وجہ سے دو قومی نظریہ کا خیال مختلف قائدین کے ذہن میں ابھرا اور تقسیم ہند کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خاں نے ۱۸۹۰ء میں یوپی کے مولانا عبدالحلیم شرر نے' ۱۹۱۵ء میں پنجاب کے چودھری رحمت علی نے' دہلی کے عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری نے ۱۹۲۲ء میں بھی پیش کیا۔ ۱۹۲۳ء میں سرحد کے سردار محمد گل خاں نے ۱۹۲۵ء میں مولانا محمد علی جوہر نے تقسیم ہند کا ذکر کیا۔ مگر ۱۹۲۵ء میں جس شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ تقسیم کی بات کی گئی اور عملی منصوبہ پیش کیا گیا اس سے قبل تک نہیں آتا یہ منصوبہ ۱۹۲۵ء میں ایک رسالے میں شائع ہوا جس کا عنوان ہے "ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی" (مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اس رسالے کے مصنف کا نام محمد عبدالقدیر

ہے۔ یہ بزرگ بعض محققین کے نزدیک اہل سنت و جماعت کے عالم اور عدالت عالیہ حیدر آباد دکن کے مفتی اعظم مولانا عبدالقدیر بدایونی تھے۔ اس منصوبے میں پاک و ہند کے جن مقامات کی نشاندہی کی وہ سب کے سب حیرت انگیز طور پر پاکستان میں شامل ہوئے۔ غالباً ڈاکٹر اقبال نے اسی منصوبے کو سامنے رکھ کر سیاسی پلیٹ فارم سے سب سے پہلے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی جو ۱۹۴۰ء میں مسلمانان ہند کے ایک متفقہ مطالبے کی صورت میں سامنے آئی۔ حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانان پاک و ہند کی اکثریت کی آواز تھی جو بعد میں ہر دل کی آواز بن گئی۔

.... (۳) ....

قائداعظم محمد علی جناح کی انتھک جدوجہد اور دوسرے بہت سے علماء، دانشوروں، سیاست دانوں اور کارکنوں کی قربانیوں نے یہ دن دکھایا کہ بحمدللہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آ گیا۔ پاکستان کے ہر صوبے کی حالت میں انقلاب آیا اور پہلے جیسے حالات نہ رہے۔ ہر صوبے نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ تعلیم کے میدان میں، تجارت کے میدان میں، صنعت و حرفت کے میدان میں، حرب و حزب کے میدان میں کیونکہ اب مدمقابل وہ طاقت نہ رہی تھی جس نے مسلمانوں کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے ماضی و حال کا تقابل کرنا چاہیے۔ ماضی کے حالات خود معلوم نہ ہوں تو اپنے بزرگوں سے پوچھنا چاہیے اور بزرگوں کو بغیر کسی تعصب و تنگ دلی خدا لگتی کہنی چاہیے۔ حقائق کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل ایک صدی میں وہ ترقی نہ ہوئی جو ۳۵ سال میں ہو چکی ہے۔ پاکستان نہ بنتا تو ہم اسی طرح پستے رہتے جس طرح ایک صدی تک پستے رہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک صدی تک یہ حال رہا کہ پاکستان کی سرزمین پر مسلمانوں میں گنے چنے لوگ تاجر، پروفیسر، انجینئر، ڈاکٹر اور زمیندار تھے۔ حد تو یہ ہے کہ طالب علم بھی آبادی کے لحاظ سے برائے نام تھے۔ اب ہزاروں کی تعداد میں تاجر بھی ہیں، پروفیسر بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، انجینئر بھی ہیں، زمیندار بھی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں طالب علم بھی ہیں۔ حالات بدل گئے، ایک انقلاب آیا جو سب کے سامنے ہے۔ اس کی قدر جب ہو گی جب آپ اپنے ماضی کو جھانک کر دیکھیں گے۔ پاکستان اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ اس کی قدر کریں۔ اس کو اپنے خون جگر سے سینچیں جہاں تک بھی ہو اس کو باغ و

بہار بنائیں۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے!

مگر دشمن کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کمزور ہو تاکہ دنیا دشمن کی قوت کا لوہا مانے۔ مگر آپ نے دیکھا ہوگا کہ پاکستان کی قوت و کمزوری کا ہندوستان پر اثر ہوتا ہے۔ جب پاکستان قوی ہوتی ہے تو ہندوستان کا لب و لہجہ مصالحانہ بلکہ خوشامدانہ ہو جاتا ہے اور جب کمزور ہوتا ہے تو اس کا انداز غیر مصالحانہ اور جارحانہ ہو جاتا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں جو حالات گزرے ہم میں سے بہت سے لوگوں کو معلوم ہیں اس وقت ہندوستان کی یہ کیفیت تھی کہ گویا ان کا ہر فرمان ہمارے لئے واجب الاذعان ہے۔ زمین ہماری حکم ان کا چلنے لگا اور بالآخر وہ روز سیاہ بھی آیا کہ سرزمین پاک پر ان کی فوجیں دندنانے لگیں اور پھر زمین کا وہ قطعہ ہی ہاتھ سے جاتا رہا۔ ت۔ عرض کرنا ہے کہ ایسے حریف سے ہشیار رہنا چاہئے جو موقع کی تاک میں بیٹھا ہو اور موقع پر کام کر گزرنے کا عادی ہو۔

ہندوستان کی جفا شعاریوں اور پاکستانیوں کی وفا شعاریوں کی داستان بہت طویل ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے جب پاکستان وجود میں آیا۔ اس کو اپنے پیر پر کھڑے ہونے نہ دیا۔ کشت و خون کا بزار گرم کر کے مہاجرین کا ایک سیلاب بھیج دیا گیا۔ ضلع گورداسپور پنجاب، پاکستان کو مل چکا تھا اور اس سے ریاست جموں و کشمیر پر پاکستان کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ اندرون خانہ چالیں چل کر تقسیم کے منظور شدہ منصوبے میں بروقت ترمیم کرا کے ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو گورنر جنرل ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کرا دیا گیا کہ ضلع گورداسپور پاکستان سے چھین کر ہندوستان کو دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں دو روز سے پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس طرح دغا کر کے ہندوستان نے ریاست جموں و کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصانات اور ناقابل پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد پاکستان اور ہندوستان کی جو ریاست جس حکومت میں شامل ہو وہ مختار ہے خواہ پاکستان میں شامل ہو یا ہندوستان میں یا خود مختار آزاد رہے لیکن کیا ہوا؟ دوسرے ہی سال مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست حیدر آباد دکن جو دنیا کے مسلمانوں کا سہارا تھی

ایک فوجی حملے کے ذریعے قبضے میں کرلی گئی اور ہزاروں مسلمان مجاہدین کو ٹینکوں تلے بے دردی سے روند دیا گیا اور مسلمانوں کی عظمت کا نشان مٹا دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب ۱۹۴۸ء میں پاکستانی قوم کو قائداعظم کی موت نے دم بخود کر دیا تھا اور وہ غم سے نڈھال کفن و دفن کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اسی طرح دوسری مسلمان ریاستوں پر بھی یکے بعد دیگرے قبضہ کرلیا گیا۔ لیکن پاکستان میں ہر موقع پر ہندوستان کے ساتھ نیکی کی۔ سب سے نازک موقع وہ تھا جب چین نے ہندوستان پر بھرپور حملہ کیا۔ کشمیر پر قبضہ کرنے کا وہ بہترین موقع تھا لیکن ہندوستانی سفیر نے صدر محمد ایوب خاں سے مل کر یہ یقین دہانی چاہی کہ پاکستان ہندوستان پر حملہ تو نہیں کرے گا تو صدر نے نیک دلی کے ساتھ یہ یقین دلا دیا کہ پاکستان کی سرحدوں سے ہندوستان پر کسی قسم کا حملہ نہیں ہوگا۔ صدر محمد ایوب خاں وہی صدر ہیں جنہوں نے مشرقی پاکستان میں ہندوستانی افواج کی خفیہ پیش قدمی کے وقت ان کے جنرل کو گرفتار کیا تھا پھر اس جنرل کو چھوڑ دیا گیا اور پھر یہی جنرل ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پنجاب کے محاذ پر پاکستان کے خلاف ہندوستانی فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ تاریخ نے ایسے عجائب کم دیکھے ہوں گے۔ یہ سارے حقائق ہم کو اپنے سامنے رکھنے چاہیئے کسی کے کہنے پر جل کر خود کو اور اپنے پیارے وطن کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔

.... (۴) ....

پاکستان بننے کے بعد کچھ کوتاہیاں ہم سے ضرور ہوئیں جن کا تدارک ضروری ہے۔ بہت سی باتیں ہیں چند ایک کا ذکر کرتا ہوں۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں جب کانگریس قائدین یہ کہا کرتے تھے قومیت کی بنیاد مذہب نہیں وطن ہے تو ہم کہا کرتے تھے کہ نہیں مسلم قوم کی تشکیل دین و مذہب سے ہوتی ہے، جغرافیائی حدود سے نہیں۔ اس لئے ہم "ہندوستانی" نہیں "مسلم" ہیں اور صرف "مسلم" ہیں۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مگر جب پاکستان بن گیا تو نہ معلوم کیوں قومیت کے خانے میں "پاکستانی" لکھا جانے لگا حالانکہ "وطنیت" کے خانے میں "پاکستانی" لکھا جاتا اور "قومیت" کے خانے میں "مسلم" لکھا

جاتا۔ بہر حال جب لا محدودیت کا دعویٰ کرنے والا محدود ہو گیا تو مختلف مسائل پیدا ہونے لگے۔ بات ملک سے نکل کر صوبوں تک جا پہنچی اور صوبوں سے وابستگی پر اصرار کیا جانے لگا اور اس پر اعتراض ہونے لگا کہ ہندوستان سے ترک وطن کر کے آنے والوں کو "مہاجر" نہ کہو اور یہاں کے خوش آمدید کہنے والوں کو "انصار" نہ کہو۔

حالانکہ یہ وہ پیارے الفاظ ہیں جس کو پہلی صدی ہجری میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما کر جاوداں بنا دیا اور مہاجر و انصار کو آپس میں اس طرح ملا دیا کہ دو سگے بھائی بھی کیا ملتے ہوں گے۔ حقیقت میں "مہاجر اور "انصار" دو تاریخی اصطلاحیں ہیں۔ جب کسی کو "مہاجر" کہا جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنا حق جتانے لگے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق ان خوش بختوں سے ہے جنہوں نے پاکستان کے لئے جان و مال کی قربانیاں دیں اور جب "انصار" کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق ان سعادت مندوں سے ہے جنہوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ مصیبت میں ان کا ساتھ دیا اور ہر طرح سے ان کی خدمت کی ایثار و قربانی اور احسان و اخلاص ایسی چیزیں نہیں جن کو بھلا دیا جائے یہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

تو عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے مسلم قومیت کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنی قومیت کو جغرافیائی حدود سے منسلک کر لیا۔ حالانکہ پردہ غیب سے تو یہ آواز آ رہی تھی۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اس انداز فکر نے پاکستان بننے کے بعد بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ اسلامی نظریاتی حکومت میں دوسری اہم چیز یہ تھی کہ ہم عدل و علم اور علاج کو بلا قیمت فراہم کرتے۔ عدل سے زندگی کی روحانی صحت برقرار رہتی ہے۔ علم سے دماغی صحت اور علاج سے جسمانی صحت۔ جب تک افراد ان تینوں اعتبار سے تنومند اور صحت مند نہ ہوں ایک مستحکم اور فعال معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام توانائیاں اور ذرائع دیانتداری اور دردمندی کے ساتھ بقائے صحت کے لئے استعمال کی جائیں' باتیں کم کی جائیں کام زیادہ۔

میں یہاں صرف علم کی بات کروں گا۔ قومی مزاج کی تعمیر میں "نصاب" بنیادی اہمیت کا

حامل ہے۔ نظریاتی حکومت میں اس سے زیادہ اہم اور نازک چیز کوئی نہیں لیکن برسوں اس سے غفلت برتی گئی اور ایسا نصاب فراہم نہیں کیا گیا جو مسلمان نہ بنائے تو کم از کم پاکستانی ہی بنا دے۔ لیکن اب کچھ کوششیں کی جا رہی ہیں مگر انقلابی کوششوں کی ضرورت ہے جس سے پورے نصاب کا مزاج بدل جائے اور وہ فکر و نظر کی صحیح سمت میں افراد کی پرورش کر سکے۔ نصاب کے ساتھ ساتھ استاد کی بھی یاد آتی ہے' اسلامی حکومت میں استاد کا باوقار ہونا لازمی ہے۔ آج کل انسان عزت کے لئے جیتا ہے یا دولت کے لئے یہ چیزیں میسر نہ آئیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو کر خود برباد ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی برباد کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں استاد کی اتنی عزت نہیں جتنی عزت ہونی چاہیے۔ نظریاتی ملکوں میں استاد معاشرے کا اہم ترین اور محترم ترین فرد ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں صورت حال مختلف ہے استاد اپنی عزت کے لئے گریڈوں کا سہارا لیتا ہے پھر جہاں جاتا ہے اس کو وہ عزت نہیں ملتی جو ملنی چاہیے۔ جس طرح والدین جسم کے مربی ہیں اسی طرح استاد دل و دماغ کا مربی ہے۔ یہ والدین سے زیادہ قدر و منزلت کے لائق ہے۔ ہر پڑھا لکھا کسی نہ کسی استاد کا شاگرد ہوتا ہے تو یہ بات دل میں ہونی چاہیے کہ یہ استاد ہی ہے جس کی تعلیم نے اس مرتبے پر پہنچایا جس طرح والدین کی تربیت نے اس کو پروان چڑھایا' پھر کوئی ایسا شریف انسان نہ دیکھا جو والدین کی عزت و تکریم سے کتراتا ہو تو پھر ہم کیوں ایسے خود فراموش ہو جائیں کہ استادوں سے ان باتوں کی توقع رکھیں جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں سے رکھتے ہیں۔ ان کو عزت دینا ہمارا دینی اور ملی فریضہ ہے یہ خود ہمارے لئے باعث سعادت ہے اور معاشرے کے لئے ایک نیک فال۔ استاد کسی معمولی ہستی کا نام نہیں یہ وہ ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں نے جس کو سواریوں پر بٹھایا اور خود پیدل چلے۔ یہ وہ ہے خلیفہ ہارون الرشید نے جن کے ہاتھ دھلائے۔ یہ وہ ہے خلیفہ مامون الرشید اور امین الرشید نے جن کی جوتیاں اٹھائیں۔ یہ وہ ہے اکبر بادشاہ نے جن کی جوتیاں سیدھی کیں۔ ہاں معاشرے کی بڑی محترم ہستی کا نام استاد ہے' وہ عظمتوں کا معمار ہے' وہ رفعتوں کا شہکار ہے۔

ہمارے معاشرے میں استاد کو جو عزت ملتی ہے اس کا حال تو آپ نے پڑھا۔ اس کی دولت کا حال یہ کہ جو کچھ اس کو ماہانہ ملتا ہے اگر کاغذ کے روپوں کے بجائے سونے کی اشرفیوں میں ملتا تو پچیس سال گزر جانے اور ترقیوں کے مختلف مراحل طے کرنے کے باوجود ہوش ربا گرانی کی وجہ

سے وہ اپنے آپ کو اسی جگہ یا اس سے پیچھے پاتا جہاں ۲۵ سال پہلے تھا۔ حالانکہ اس طویل عرصے میں اس کی ذمہ داریاں دس گنا ہو چکی ہیں۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ امتحان لینے' کاپیاں جانچنے کا معاوضہ اتنا کم رکھا گیا ہے کہ ملبہ کی ٹوکری ڈھونے والا مزدور ۶ گھنٹے محنت کر کے جتنا کما لیتا ہے یہ اس سے آدھا بھی نہیں پاتا۔ پھر لطف یہ کہ یہ رقم بھی فوراً نہیں ملتی بعض اوقات مہینوں لگ جاتے ہیں۔ خیر' بات سے بات نکلتی ہے۔ ذکر تھا اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا اور پاکستان کے وجود میں آنے کا۔ بہرکیف ہم کو اپنی کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دشمن کے عزائم پر نظر رکھنی چاہئے اور اپنی سادہ لوحی سے کسی کی چال میں نہ آنا چاہئے۔

.... (۵) ....

ہماری صفوں میں دشمن کے آدمی کام کر رہے ہیں جو طرح طرح سے ہمارے دل کو میلا کرتے ہیں' ہم کو ایک دوسرے سے نفرت سکھاتے ہیں اور اپنا کام بناتے ہیں۔ پس منظر میں رہتے ہیں' سامنے نہیں آتے۔ اس نفرت سے وہ اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور استعمال ہم کو کرتے ہیں۔ جب حالت بگڑ جاتی ہے' کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا حادثہ ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ کے حادثات سے سبق حاصل کرنا چاہئے' وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو تاریخ کو فراموش نہیں کرتیں ہم کو بھی ماضی سے آگاہ رہنا چاہئے تاکہ مستقبل کی تعمیر ممکن ہو۔ دشمن اپنے دشمن سے کئی محاذوں پر جنگ کرتا ہے۔ دور جدید میں سب سے اہم محاذ فکری محاذ ہے یعنی دشمن اپنے دشمن کو رعایا کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اس کی قوم اور ملک پر قبضہ جماتا یا دوسرے دشمنوں کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ غور کریں ہم وہی ہیں جن کے اسلاف اسلام پر مرتے تھے' ہم وہ ہی ہیں جن کے اکابر نے اپنی قوت ایمانی سے ایک ملک پاکستان بنایا' اس کو آباد کیا اور اپنے خون جگر سے اس کو سینچا۔ پھر اچانک کیا ہو گیا کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو اسلام کے شیدائی نہیں' جو اپنے اسلاف کے کارناموں پر پانی پھیرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ باتیں انہوں نے اپنے بزرگوں سے نہیں سیکھیں بلکہ ملک و دین کے بدخواہوں نے ان کو یہ باتیں سکھائی ہیں۔ اب ان کو یہ سوچنا چاہئے

کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ یہ نظریاتی ملک ہے اس کا قیام اسلام سے سچی محبت اور اپنے ان اکابر کے کارناموں کو یاد رکھنے میں ہے جنہوں نے اس کو بنایا۔ اصل میں یہ اس ملک کی بنیادیں ہیں، عمارت کو ڈھانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جائے تو سوچنے کی بات ہے جو ہمارے ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کرے وہ ہمارا دوست ہے یا دشمن؟ اس کا جواب ہر عقل والا دے سکتا ہے۔ دشمن اپنی مقصد بر آوری کے لئے کئے حربے استعمال کرتا ہے اہم حربہ یہ ہے کہ پاکستان کے نظریہ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں اور معمار پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہا "پاکستان بنا کر ہم کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ نہ پاکستان بنتا نہ یہ آپس کے لڑائی جھگڑے ہوتے۔ اس کا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ایک باپ نے اپنی اولاد کے لئے باغ لگایا پھر وہ اولاد باغ کے پھلوں کی تقسیم پر آپس میں لڑنے لگی تو کہنے والا یہ تو نہیں کہتا کہ شکر کرو کہ یہ باغ تم کو ملا، یہ پھل تم کو ملے اس باغ کی حفاظت کرو بلکہ یہ کہتا ہے کہ باپ نے برا کام کیا اگر وہ یہ باغ چھوڑ کر نہ جاتا تو اولاد کاہے کو یوں لڑتی۔ میرے خیال میں کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا۔ اصل میں قوم میں مایوسی اور احساس محرومی پھیلا کر دشمن اپنے مفادات کی تکمیل چاہتا ہے۔ میرے نزدیک قائداعظم کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے عظیم سیاسی و روحانی پیشوا مسٹر گاندھی کو شکست دی، متحدہ ہندوستان کے ان کے منصوبے کو خاک میں ملایا اور صفحہ عالم پر پاکستان کو نمودار کیا اب مسٹر گاندھی کی عظمت کی جتنی باتیں کی جائیں قائداعظم خود بخود عظیم ہوتے جائیں گے۔ تو عرض یہ کر رہا تھا کہ دشمن نظریہ پاکستان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس طرح قائداعظم محمد علی جناح سے قوم کو بدظن کر کے اپنے عزائم کی تکمیل چاہتا ہے۔

اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے دشمن ایک اور کام کرتا ہے وہ معاشرے کے ایسے طبقہ کو تاکتا ہے جو جلد از جلد اس کے مقاصد کی تکمیل کرے اس سلسلے میں اس کی نظر "طلبہ" پر رہتی ہے مگر اکثر طلبہ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ بہت معصوم ہوتے ہیں اور اپنے سادہ لوحی اور لاعلمی کی وجہ سے ایسے کام کر جاتے ہیں جس سے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں مگر سیاست میں سوجھ بوجھ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ مطلب بر آری کے

لئے طلبہ کا انتخاب کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ بالعموم طلبہ ملازم نہیں ہوتے، فارغ التحصیل رہتے ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ ان پر کوئی گھریلو ذمہ داری نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ بالعموم ان کو کمانے کی پرواہ تو ہوتی نہیں، کھانے کی پرواہ بھی نہیں ہوتی گھر جا کر پکا پکایا مل جاتا ہے یا ہاسٹل میں کھا پی لیتے ہیں۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ وہ عمر کی اس منزل میں ہوتے ہیں جہاں جذبات غالب ہوتے ہیں اور فکر مغلوب، اس لئے جدھر بہایا جاتا ہے آسانی سے بہ جاتے ہیں۔

۵۔ پانچویں بات یہ کہ ان کو اتنا علم نہیں ہوتا جس سے انسان کھرے کھوٹے میں تمیز کرتا ہے اس کے مزاج میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اپنے قول و عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔

۶۔ چھٹی بات یہ کہ طلبہ پر بالعموم نہ والدین کا پورا قابو ہوتا ہے نہ اساتذہ کا اس لئے جو چاہے آسانی سے اپنے قابو میں کر سکتا ہے۔

۷۔ ساتویں بات یہ کہ ان کی اپنی ایک برادری ہوتی ہے ان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

۸۔ آٹھویں بات یہ کہ نظریاتی ملکوں میں نظریات کو بنانے اور بگاڑنے میں طلبہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دشمن یہ ساری باتیں ذہن میں رکھ کر قدم آگے بڑھاتا ہے اور معصوم طلبہ کو اپنے دام میں گرفتار کرتا ہے۔ یہ مسئلہ قوت استعمال کرنے سے زیادہ سمجھانے سے حل ہو سکتا ہے کیونکہ بالعموم طلبہ لاعلم ہوتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے نتائج کیا برآمد ہوں گے، سوانجام سے بے خبر ہوتے ہیں اس لئے وہ قابل رحم ہیں۔ میرے نزدیک وہ ایک ایسے نرم و نازک پودے کی مثل ہیں جس طرف اس کو ٹیڑھا کیا جائے ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم ان کو اپنا حریف سمجھ کر مقابلے شروع کر دیتے ہیں حالانکہ وہ ہمارے حریف نہیں ہمارے بچے ہیں۔ ہماری عافیت اور نجات اسی میں ہے کہ ہمیں جو خطہ زمانے پاکستان ملا ہے دل و جان سے اس کی پاسداری کریں اس کی ترقی و استحکام کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں، اپنے بھائیوں کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کریں اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ عدل و انصاف کا بول بالا ہو۔ ہمارے

اسلاف نے جس وطن کے لئے جدوجہد کی اور جس وطن کی تعمیر کے لئے ہمارے ہزاروں بھائیوں نے اپنا خون بہایا، گھربار لٹایا اس کو ضائع نہ کریں۔

مصنف کی تاریخ پاکستان کے حوالے سے دیگر نگارشات

مضامین و مقالات

۱۔ اقبال اور نظریہ پاکستان، ماہنامہ فاران (کراچی) اگست ۱۹۶۱ء

۲۔ تحریک پاکستان پر فاضل بریلوی کے اثرات ماہنامہ فیض رضا، فیصل آباد مارچ ۱۹۷۴ء

۳۔ پیغام برائے مجلس مذاکرہ "فاضل بریلوی اور تخلیق نظریہ پاکستان"

منعقدہ ۹ر مارچ ۱۹۷۴ء بمقام خالقدینا ہال، کراچی

تبصرہ

باغی ہندوستان از عبدالشاہد خاں شیروانی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء

تقسیم ہند کی پہلی مفصل تجویز اور اس کا مصنف ماہنامہ اظہار، کراچی مارچ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۳ء

تحریک پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر (غیر مطبوعہ) محررہ ۱۳ر مارچ ۱۹۸۲ء

دو قومی نظریہ اور پاکستان ☆ مجلہ "الہاشم" ہاشم آباد، مکلی، ٹھٹھہ، سندھ ۱۹۸۳ء

☆ ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور اگست ۱۹۹۴ء

☆ ماہنامہ دعوت تنظیم الاسلام، گوجرانوالہ، اگست ستمبر ۱۹۹۴ء

تحریک آزادی اور السواد الاعظم مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وكونوا مع الصدقين

اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ